



نا پسندیدہ کالم

مفتی منیب الرحمن

جب سے پاناما لیکس کا مسئلہ سامنے آیا ہے، ہماری سیاست کا مرکزی موضوع یہی ہے۔ دراصل یہ آف شور کمپنیاں ہیں، جنہیں عالمی سطح پر ابھی تک خلاف قانون قرار نہیں دیا گیا۔ ان کے ذریعے قانونی اعتبار سے جائز اور ناجائز دولت بیرون ملک منتقل کی جاتی ہے اور ٹیکس کی چھوٹ سے استفادہ کرتے ہوئے سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ اس پر اس لیے پردہ ڈالا جاتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک کا سرمایہ مغربی ملکوں کے کام آتا رہے۔ فی الحال جزوی طور پر یہ پردہ اٹھایا گیا ہے اور کچھ پردہ نشینوں کے نام آئے ہیں، ظاہر ہے صاحب اقتدار کو دباؤ میں لانے کے لیے یہ ایک اچھا حربہ ہے۔ یقیناً اس انکشاف کے پیچھے عالمی سیاست و معیشت کو کنٹرول کرنے والی طاقتوں کی آشیر باد کا فرما ہوتی ہے۔ ابتدا میں بعض سیاست دانوں نے یہ تاثر دیا کہ آف شور کمپنی بنانا ہی جرم ہے، لیکن بعد میں جب انہیں احساس ہوا کہ یہ ملامت خود اُن کی ذات پر اور اُن کے گرد و پیش موجود پاک دامن لوگوں پر بھی لگی ہوئی ہے، تو انہوں نے کہا: ”ہم نے آف شور کمپنی کو کبھی خلاف قانون نہیں کہا، ہم نے تو دولت کی بیرون ملک غیر قانونی منتقلی یعنی منی لانڈرنگ کو جرم سمجھتے ہوئے ہدف بنایا ہے اور اس میں وزیر اعظم نواز شریف اور اُن کا خاندان ملوث ہے، لہذا وہ ثابت کریں کہ یہ دولت بیرون ملک کیسے منتقل ہوئی؟۔ الغرض سپریم کورٹ میں سماعت جاری رہنے کے باوجود یہ نالک ابھی چل رہا ہے اور آئندہ انتخابات یا نظام کی بساط لپٹنے تک چلتا رہے گا۔

میں نے اس دوران بڑے قومی اخبارات کے تقریباً تمام معروف کالم نگاروں کے تاثرات اور تجزیے پڑھے، بعض نے تو ایک پوزیشن لے رکھی ہے۔ میں صرف اُن حضرات کے تاثرات اور تجزیوں کو زیادہ دلچسپی سے پڑھتا ہوں، جن پر کسی سیاسی جماعت سے غیر مشروط وابستگی کی ملامت نہیں ہے اور جو کسی حد تک اپنی ساکھ کو قائم رکھتے ہوئے اس مسئلے کو قومی قیادت کے اخلاقی زوال کی علامت اور قومی حیمت کے منافی سمجھتے ہوئے بات کرتے ہیں۔

اس قضیے کے دو پہلو ہیں: ایک اخلاقی اور دوسرا قانونی۔ اس میں دو آراء نہیں ہیں کہ پاناما لیکس کے افشا کے نتیجے میں وزیر اعظم کی اخلاقی پوزیشن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ووٹ اخلاقیات کی بنیاد پر نہیں دیے جاتے، مفادات اور وابستگیوں کی بنیاد پر دیے جاتے ہیں۔ حال ہی میں پاکستان عوامی تحریک کے سربراہ جناب ڈاکٹر علامہ طاہر القادری نے ایک ٹیلی ویژن چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا: ”آج میں ایک انکشاف کر رہا ہوں، وہ یہ کہ عوام کا ایک مفاد پرست طبقہ غیر مشروط طور پر اہل اقتدار سے جڑا ہوا ہے اور دوسرا طبقہ وہ ہے جو بے حس ہے اور لا تعلق ہے“۔ اُن کے بقول سانحہ ماڈل ٹاؤن کے موقع پر علاقے کے رہائشی لوگوں نے اُن کے زخمیوں پر اپنے دروازے بند کر دیے تھے کہ کہیں وہ گرفت میں نہ آجائیں اور صرف اُن کے اپنے کارکن میدان عمل میں

ڈٹے رہے ہیں۔

پس چند مستثنیات کے زیادہ تر کرپشن زدہ لوگ ہی بار بار جیت کر آتے ہیں۔ جناب آصف علی زرداری کا پانچ سال تک اسلامی جمہوریہ پاکستان کی صدارت پر فائز رہنا، اس بات کی سب سے روشن دلیل ہے اور یہ ہماری قومی سیاست کا عجوبہ ہے کہ آج جناب بلاول بھٹو کرپشن کے خلاف ہم چلانے کا دعویٰ کر رہے ہیں، اس تناظر میں بہتر ہوگا کہ لغت میں کرپشن کے معنی بدل دیے جائیں۔ یہاں میں کرپشن کے الزامات کی بات کر رہا ہوں، کیونکہ ہمارے ضابطہ قانون میں اس کا ثابت ہونا چنداں آسان بات نہیں ہے۔ پس اگر کسی کی خواہش یہ ہے کہ وزیر اعظم اخلاقی بنیاد پر وزارت عظمیٰ کی مسند سے دستبردار ہو جائیں، تو یہ خواہش یقیناً نہایت دلکش اور خوبصورت سہی، لیکن حقیقت کی دنیا سے بہت بعید ہے۔ اس حوالے سے ہماری سیاست کے تمام کھلاڑیوں کی اخلاقی پوزیشن کم و بیش یکساں ہے۔ مشرف دور میں جناب شیخ رشید وزیر ریلوے تھے، اُن کے عہد وزارت میں ریل کا حادثہ ہو گیا، اُن سے ایک اخبار نویس نے سوال کیا: ”کیا آپ اس حادثے کی اخلاقی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے مستعفی ہو جائیں گے، کیونکہ جمہوری ممالک میں یہ روایت موجود ہے“۔ انہوں نے کہا: ”میں کیوں استعفیٰ دوں، میں ٹرین کا ڈرائیور تو نہیں ہوں“۔

ہماری سیاست میں اخلاقی اعتبار سے جماعت اسلامی کی پوزیشن کو بہتر قرار دیا جاتا ہے اور یہ کافی حد تک درست ہے۔ جب خیبر پختونخوا کی مخلوط حکومت میں اُن کی جماعت کے وزیر خزانہ جناب مظفر سید، اس لفظ کو سید نہیں بلکہ سید پڑھا جائے، کے خلاف خیبر بینک کے صدر اور ایم۔ ڈی جناب شمس القیوم کا اشتہار شائع ہوا اور وزیر محترم نے جوابی اشتہار شائع کیا، تو اُن کے وزیر خزانہ مستعفی نہیں ہوئے، بلکہ بدستور منصب وزارت پر متمکن رہے۔ پھر صوبائی کابینہ میں جناب آفتاب شیرپاؤ کی قومی وطن پارٹی کے ایک ایسے وزیر پر مشتمل یک نفری انکوائری کمیشن بنایا گیا، جنہیں ماضی میں بدعنوانی کے الزام میں برطرف کیا گیا تھا۔ پھر انہوں نے صوبائی کابینہ میں اپنے رفیق کار وزیر کو کردار کی پاکیزگی کی سند عطا کر دی۔ اسی طرح جناب عمران خان اور اُن کے گرد و پیش موجود لوگوں میں سے آف شور کمپنی بنانے کے الزام پر کوئی بھی مستعفی نہیں ہوا، پس ہماری سیاست کا اخلاقی معیار یہی ہے۔ سوائے اُن سیاسی رقبوں کے لیے جو تحقیقات کے دوران اُن سے مستعفی ہونے یا اختیارات سے دست بردار ہونے کا مطالبہ کر رہے ہیں، جناب نواز شریف کا پیغام یہی ہوگا: کاین گناہست کہ در شہر شانیز کنند

یعنی جب آپ ایک صوبائی وزارت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہ ہو پائے، تو میں وزارت عظمیٰ کی اعلیٰ ترین مسند سے آپ کی خواہش کی تکمیل کرتے ہوئے کیوں دستبردار ہو جاؤں؟، کیونکہ ہم دونوں کی اخلاقی پوزیشن یکساں ہے۔

دوسرا پہلو قانونی ہے: سو جو نظام قانون ہم نے برطانیہ سے وراثت میں پایا ہے، اُس کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان بے قصور ہے تا وقتیکہ اُس کا جرم عدالت میں ثابت نہ ہو جائے اور اسلام کا اصول بھی تقریباً یہی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”الزام کا بار ثبوت مدعی پر ہے اور عدم ثبوت کی صورت میں مدعی علیہ کو قسم دی جائے گی، (سنن ترمذی: 1341)۔“ جناب عمران خان نے جناب ہارون الرشید کے کالم سے استفادہ کرتے ہوئے ”حلاشی دینے کا نعرہ لگا رکھا ہے“۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کسی پر چوری کا الزام لگایا جائے اور پھر کہا جائے کہ تم ثابت کرو کہ تمہارے گھر میں جو بھی سامان ہے وہ جائز طور پر تمہاری ملکیت ہے، ورنہ وہ سب چوری کا ہے۔ حالانکہ چوری کا الزام لگانے والے کو

ثابت کرنا پڑتا ہے کہ اس گھر میں فلاں چیز میرے ہاں سے چوری کر کے لائی گئی ہے۔ سو فلسفہ قانون و انصاف کے تحت منی لائڈ رنگ کے الزام کا بار ثبوت مدعیان پر ہے اور اس سلسلے میں عدالت کو مور والزام قرار دینا یا عدالت پر دباؤ ڈالنا مناسب نہیں ہے۔ عدالت قانون کے تحت انصاف کرنے کی پابند ہوتی ہے، چنانچہ جناب جسٹس آصف سعید کھوسہ نے دوران سماعت کہا: ”ہم انصاف کے لیے قانون کا قائل نہیں کر سکتے، یعنی ہمیں قانون کے تابع رہ کر انصاف دینا ہوتا ہے۔ اسی بات کو چیف جسٹس جناب انور ظہیر جمالی نے ان الفاظ میں بیان کیا: ”ہم دباؤ میں آ کر فیصلے نہیں کر سکتے“۔ اس کا مفہوم مخالف بھی یہی ہے کہ عدالت کے باہر فریق مخالف کو مجرم اور اپنے آپ کو فاتح قرار دے کر قبل از وقت فیصلے صادر کیے جا رہے ہیں اور یہی عدالت کو دباؤ میں لانے کا حربہ ہے، چنانچہ انہوں نے اپنی سربراہی میں قائم شیخ کی ساری کارروائی کو کالعدم قرار دیتے ہوئے یہ معاملہ اپنے جانشین پر چھوڑ دیا۔

لیڈی ڈیانا کا ٹریفک حادثہ چونکہ فرانس کی حدود میں ہوا تھا، اس لیے اُس وقت کہا گیا تھا: فرانس کا فلسفہ قانون یہ ہے کہ آپ مجرم ہیں تا وقتیکہ آپ اپنے آپ کو الزام سے بری ثابت نہ کر دیں۔ مجھے اس کا علم نہیں ہے، کوئی ماہر آئین و قانون ہی بتا سکتا ہے کہ آیا یہ درست ہے۔ ہمارے نظام آئین و قانون اور نظام عدل میں تو برطانوی فلسفہ قانون ہی رائج ہے اور آئے دن عدالتیں اسی کے تحت مقدمات کے فیصلے کرتی ہیں۔ جناب اعتراف احسن سمیت سارے نامی گرامی و کلاء انہی خدمات جلیلہ کے عوض ناقابل یقین حد تک بھاری فیسیں وصول کرتے ہیں۔ الغرض جو کچھ عدالت کے باہر میڈیا پر ارشادات نشر ہوتے ہیں، اگر یہ عدالتی اصول بن جائے تو ہمارے ان ماہرین آئین و قانون کا کاروبار ٹھپ ہو جائے۔ حقیقت یہی ہے، باقی سب کچھ وزن شعر، ٹیلی ویژن کے ٹکڑ اور اخبارات کی سرخیوں کے لیے ہوتا ہے، عربی کا مقولہ ہے: ”سچ کڑوا ہوتا ہے اگر چہ وہ ہیرا ہوتا ہے“ اور ہم ”میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا تھو تھو“ کے عادی ہیں۔

بہتر ہوگا کہ پارلیمنٹ کے اندر سب جماعتیں اتفاق رائے سے ایک آئینی ترمیم منظور کریں کہ عوامی نمائندگی اور حکومتی مناصب پر صرف وہی شخص فائز ہو سکے گا، جس کے پورے خاندان کا بیرون ملک کاروبار اور جائیداد نہ ہو اور جن کا کاروبار یا جائیداد بیرون ملک موجود ہے، انہیں پابند کیا جائے کہ اپنی پوری تفصیل فراہم کریں اور چھ ماہ سے ایک سال کے اندر وہ اپنا تمام سرمایہ پاکستان لے کر آئیں۔ جب کہ ہمارا حال یہ ہے کہ امریکی شہری جناب معین قریشی کو وزیر اعظم پہلے بنایا گیا اور اُن کا پاسپورٹ اور قومی شناختی کارڈ دوران سفر بعد میں بنا۔ یہی وجہ ہے کہ کرپشن کے نام پر تمام تر شور و غوغا کے باوجود پارلیمنٹ میں نمائندگی رکھنے والی ساری جماعتیں مکمل اتفاق رائے سے بے لاگ احتساب کا ایک جامع قانونی پیکیج بنانے پر آمادہ نہیں ہیں۔ سپریم کورٹ آف پاکستان پبلی بار گین کے نام پر قومی احتساب بیورو کو آئے دن ہدف تنقید بناتی رہتی ہے، اخلاقی اعتبار سے اور انصاف کی روح کے مطابق عدالت عظمیٰ کا یہ تبصرہ سو فیصد درست ہے۔ لیکن نیب جناب جنرل پرویز مشرف کا بنایا ہوا قانون ہے، سترہویں آئینی ترمیم میں اسے تحفظ حاصل ہے، اسے پبلی بار گین کہیں یا ”استدعا برائے ملک“، یہ بہر حال ”لا آف دالینڈ“ ہے۔ نیب کے چیرمین و قفاؤ قفا دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے تقریباً دو سو بیٹھ ارب روپے کی ناجائز لوٹی ہوئی دولت برآمد کی ہے، یعنی عدالتوں کے ذریعے کچھ بھی برآمد نہیں ہوا اور چند مستثنیات کے سوا بالآخر جلد یا بدیر تمام ملزمان باعزت بری ہوتے رہے ہیں۔ اب جب کہ عارضی طور پر سپریم کورٹ نے پبلی بار گین پر پابندی لگائی ہے، تو خود پتا چل جائے گا کہ عدالت کے ذریعے کیا کچھ برآمد ہوتا ہے۔